عربوں کی قومی نفسیات[1]

مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی

دنیا کی قومیں ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً انگریزی ذہنیت فرانسیسی ذہنیت سے مختلف ہے اور مصری ذہنیت ان دونوں سے الگ ہے۔ یہ ذہنی اور نفسیاتی تفاوت اس ہیئت اجتماعی اور افتادِ طبیعت کے اختلاف پر مبنی ہوتا ہے جس میں قوم نشو و نما پاتی ہے۔ لہٰذا دنیا کی تمام قومیں ذہنی اور نفسیاتی ارتقاء کے مسلسل مدارج طے کرتی ہیں۔ اور ہر ارتقائی درجہ نام ہے چند ذہنی اور نفسیاتی امتیازات خاصہ کا جو دوسرے میں نہیں پائے جاتے۔

قومی خصوصیات ہر ایک قوم کے افراد میں مراتب عقل و فہم اور مدارج تعلیم و تربیت کے اختلاف کے باوجود ایک مشترک یگانگت اور یکجہتی پائی جاتی ہے۔ اس یگانگت کی جھلک تم ان کے مظاہر بدنی میں بھی پا سکتے ہو۔ چنانچہ تھوڑی سی مشق کے بعد تم صورت دیکھ کر بتلا سکتے ہو کہ یہ شخص انگریز ہے یا فرانسیسی یا مصری۔ بالکل اسی طرح جسمانی یکسانیت کے مانند ہر قوم کے افراد میں ذہنی وحدت اور فکری یکسانیت بھی ضرور پائی جاتی ہے۔

عربوں کی نفسیات اب سوال یہ ہے کہ عرب میں وہ نفسیاتی اور ذہنی وحدت کیا ہے؟ اگر عرب ذہنیت کی تمثیل کے لیے کسی عرب کو بطور نمونہ تمہارے سامنے پیش کریں تو اُس کی صفات اور اوضاع و اطوار کیا ہونگے؟ مفکرین اور ماہرین نفسیات کی رائے اس بارے میں بہت مختلف ہے، ان میں سے بعض ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

---

[1] مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی مصر کی مشہور کتاب "فجر الاسلام" کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ پہلا حصہ بہت کچھ ہو چکا ہے۔ یہ مضمون اسی کتاب کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔

شعوبین کی رائے | (۱) بعض شعوبین (وطن پرستوں) کا نظریہ عرب کے متعلق یہ ہے :-

روئے زمین کے جس خطہ میں بھی مشرقی قومیں آباد ہیں وہاں ان کی اپنی حکومت ہے، شہر ہیں دستور و آئین ہے حکومتیں اُن کی پاسبان ہیں شہروں میں وہ یکجا رہ کر تمدن زندگی بسر کرتے ہیں دستور و آئین کا احترام کرتے ہیں مستقل فلسفہ ہے جس کے وہ خود موجد ہیں۔ آلات و اسلحہ اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے عجیب غریب اختراعات کے وہ مالک ہیں مثلاً ریشم بافی شطرنج یا روم کی طرح تخلیق عالم، آئین حکومت اور اصطرلاب سے متعلق مستقل فلسفہ۔ عرب ہی ایک ایسی قوم ہے جس کا نہ کوئی مرکز حکومت ہے جس کے زیر سایہ وہ جمع ہوں افتادہ افراد اُس سے وابستہ ہوں ظلم و ستم کی طاقتوں کو وہ کچلے اور پامال کرے کوتاہ اندیش افراد پر پابندیاں عائد کرے نہ کسی صنعت و حرفت میں اُن کا حصہ ہے اور نہ کوئی اُن کا فلسفیانہ کارنامہ ہے ہاں شعر و شاعری ضرور ایک ایسا فن ہے جس میں اُن کی جودت طبع کے کارنامے پائے جاتے ہیں، سو عجمی اقوام اس میں بھی ان کے ساتھ شریک اور حصہ دار ہیں۔ رومیوں کے پاس بھی صحیح اوزان و بحور میں بہترین اشعار کا ذخیرہ موجود ہے۔

جاحظ کی تردید | (۲) جاحظ اس رائے کی تردید کرتا ہے اور عرب کو دوسری اقوام کا ہم پلہ ثابت کرتا ہے۔ دوسری اقوام کے ساتھ عرب کا موازنہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے :-

ہندیوں کے پاس فلسفی مضامین کا مدون ذخیرہ اور تصانیف بیشک ہیں مگر نہیں بتلایا جا سکتا کہ وہ کس فکر و دماغ کا نتیجہ ہیں نہ کسی مشہور فرد سے ان کی نسبت ہے اور نہ کسی قابل ذکر عالم سے۔ کچھ کتابیں ہیں جو وراثتاً نقل ہوتی چلی آتی ہیں۔ کچھ اخلاق و آداب ہیں جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں ہمیشہ سے رائج ہیں یونان کا فلسفہ اور منطق ہے مگر اس کے موجد کی زبان پر مہر سکوت ہے اور اپنی کم مائگی پر رو رہی ہے۔ فصاحت و بیان میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

فارس میں خطبا، اور مقررین ضرور ہیں لیکن ان کے کلام کا تمام ذخیرہ اور ان کے سوا تمام عجمیوں کے علمی مضامین طویل غور و فکر، مجاہدہ اور خلوت نشینی سے متعلق ہیں اور بس۔ عرب کے پاس جس قدر علمی ذخیرہ ہے وہ سراسر بروقت اور بلا تکلف آمد اور برجستہ بدیہہ گوئی ہے بلکہ وحی و الہام ہے، نہ وہاں دماغ سوزی ہے اور نہ ذہنی کاوشیں

نہ وہاں فکر کی آوارگی ہے، نہ حجت و برہان کی گداگری ہے اور نہ علم و فلسفہ کی بھیک، وہاں صرف تخیل کی پرواز ہے اور اس کے ساتھ ہی لطیف معانی کی مسلسل آمد اور شیریں الفاظ کی دھواں دھار بارش، ذہن اور فکر کی پامالی اور خستگی کے بجائے نشاط و انبساط کی کارفرمائی ہے۔ وہ اُمّی تھے لکھنے پڑھنے سے بے نیاز، ماں کے پیٹ سے فضل و کمال کا فطری جوہر لے کر پیدا ہوتے تھے، تکلف و تعسف سے ناآشنائے محض۔ بہترین اور ٹھوس کلام ان کے پاس بہت وافر اور رائج تھا۔ ملک بیان کے وہ با اقتدار بادشاہ اور اقلیم سخن کے مطلق العنان حاکم تھے۔ وہ دوسروں کی طرح غیروں کے علوم رٹنے اور ان کے آثار علمیہ کی تقلید و پیروی کرنے کو اپنے لیے عار جانتے تھے اُن کے سینوں میں وہی ذخائر محفوظ رہتے تھے جو اُن کے لیے مرغوب، دل آویز اور اُن کے رگ و پے میں سما جانے والے ہوتے اور بلا قصد و اختیار بدون دماغ سوزی و جگر کاوی کے اُن کی عقل میں آجاتے۔

ابن خلدون کی رائے عربوں کی فطرت کے متعلق ابن خلدون نے تاریخ میں متعدد مقامات پر اظہار رائے کیا ہے، ہم بقدر ضرورت اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

ابن خلدون کی رائے میں عربوں کی اجتماعی معاشرت ایک ایسی طبعی اور قدرتی معاشرت تھی جس سے گذرنا نشوو ارتقاء کے مراحل طے کرتے وقت انسانی فطرت کے لیے ناگزیر ہے وہ اس مفہوم کو ذیل کے الفاظ میں ادا کرتا ہے: عرب ایک قوم ہے جس کی فطرت بالکل سادہ اور طبیعی یعنی غیر اکتسابی ہے" ایک دوسرے مقام پر وہ لکھتا ہے "عرب اپنی طبعی اور پیدائشی وحشت کی بنا پر جو ہر انسان کی فطرت میں بتقاضائے حیوانیت موجود ہے غارتگر اور مفسد واقع ہوئے تھے۔ جہاں تک خطرات اور مقابلہ کی سختیوں سے دوچار ہوئے بغیر ان کی دسترس ہوتی تھی، تاخت و تاراج کرتے تھے اور پھر سرسبز صحراؤں میں بھاگ جاتے تھے۔ چنانچہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور محفوظ مقامات میں آباد قبائل ان کی تاخت و تاراج اور فتنہ و فساد سے محفوظ رہتے تھے کھلے میدانوں میں رہنے والے غیر محفوظ قبائل جب کبھی اپنی کمزوری اور پشت پناہ طاقتوں سے محروم ہو جانے کے باعث ان کے قابو میں آجاتے تو ان کی تاخت و تاراج کا نشانہ بنتے اور وقتاً فوقتاً مسلسل تاخت و تاراج سے پامال ہو کر مغلوب ہو جاتے پھر غارتگر بھی کوئی

ایک قبیلہ نہ ہوتا بلکہ یکے بعد دیگرے مختلف غارتگروں کے دستہائے تعدی دراز ہوتے اور اسی کے ساتھ مختلف سیاستوں کے دور سے گذرتے یہاں تک کہ اپنی مسلسل گردشوں سے پامال ہوکر دنیا سے ان کا نام ونشان مٹ جاتا۔ جب کسی حصہ ملک پر انکا دست تعدی دراز ہوتا تباہی و بربادی بہت جلد اس کا خیر مقدم کرتی وہ عمارتوں کو برباد کرتے اور اُن کے پتھر اپنے صحرائی چولہوں کے لیے لیجاتے، چھتوں کے شہتیر اور کڑیاں خیموں کے ستونوں کے لیے اُکھاڑ لاتے۔ چھولداریوں کی چوبی میخیں اُن سے بناتے، اور پھر اس لوٹ کھسوٹ کی کوئی حد نہیں ہوتی جس پر بس کریں۔ کسی آئین و دستور کی ترویج اور فتنہ و فساد کی راہیں مسدود کرنے کی جانب اصلاً رجحان والتفات نہ تھا ان کی توجہات کا محور صرف مال و دولت کی لوٹ تھی۔ خواہ تاخت و تاراج کے عنوان سے ہو خواہ تاوان و نذرانہ کے نام سے یہی ان کا مقصد اصلی تھا۔ اس کے حصول کے بعد انہیں نہ اپنی عمرانی حالت کی اصلاح سے کچھ سروکار اور نہ تمدنی مصالح سے کچھ واسطہ۔ قبیلہ کی سرداری کے لیے بیحد حریص تھے شاذ و نادر ہی کوئی عرب دوسرے کے حق میں ریاست و سیادت سے دستبردار ہوتا، اگرچہ اپنا باپ، بڑا بھائی یا خاندان کا بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے حکام اور سرداران قبائل کی تعداد بہت زیادہ ہوتی۔ رعیت سے خراج اور ٹیکس وصول کرنے والے ہاتھ اور حکومت کرنے والی قومیں متعدد ہوتیں۔ ان سب کو علیحدہ علیحدہ خراج ادا کرنا ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ رعیت تباہ و برباد اور رفتہ رفتہ فنا ہوجاتی۔ اس کے ثبوت کے لیے ان ملکوں کو دیکھو جن پر آغاز تخلیق سے اب تک ان کا دستِ تصرف دراز ہوا۔ کس طرح وہ بستیاں برباد اور باشندے تباہ ہوتے۔ یمن میں مساکن عرب چند شہروں کے سوا ویران پڑے ہیں۔ عراق عرب میں عربوں کی بستیاں جنکی آبادی اہل فارس کی رہین منت تھی کھنڈر ہوگئی ہیں۔ علیٰ ہذا جہاں تک شام میں ان کے قدم پہنچے اس کا بھی یہی حشر ہوا۔

عرب اپنی طبعی شدت حمیت، بلند ہمتی اور حرص ریاست و سیادت کی بنا پر جوان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ آپس میں بھی ایک دوسرے کے مطیع اور فرماں پذیر نہیں ہوتے۔ کبھی ان کے رجحانات ایک مرکز پر جمع نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان میں اگر کبھی تشکیل حکومت ہوتی بھی ہے تو مذہبی رنگ میں۔ نبوت ہو ولایت ہو

یا کوئی اور مذہبی تحریک ہو۔

اور چونکہ شہروں کے آباد کرنے کے لیے محل وقوع، آب وہوا، صفائی و پاکیزگی اور قابل زراعت و کاشت زمینوں کے انتخاب کرنے میں جس حُسن انتخاب کی ضرورت ہے اس کی اصلا پروا نہیں کرتے بلکہ اس سے بے بہرہ اور تہی دامن ہیں اس لیے جو عمارتیں وہ بناتے ہیں اور جو بستیاں وہ آباد کرتے ہیں بہت جلد ویران اور غیر آباد ہو جاتی ہیں۔ زمینیں ان صفات میں مختلف ہوتی ہیں اور شہروں کی بھلائی یا برائی اسی حسن انتخاب میں مضمر ہے۔ عرب اس سے کوسوں دور ہیں۔ وہ صرف اپنے اونٹوں کی چراگاہیں دیکھتے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ آب وہوا اچھی ہے یا بُری پانی کم ہے یا زیادہ، وہ نہیں دریافت کرتے کہ کاشت کی زمینیں، چراگاہیں، باغات، سبزہ زار، ہوائیں عمدہ ہیں یا نہیں چنانچہ کوفہ، بصرہ اور قیروان کی آبادی کے لیے جگہ انتخاب کرتے وقت دیکھ لیجیے انہوں نے کس طرح ان تمام عمرانی ضروریات کو نظرانداز کر دیا اور صرف اونٹوں کی چراگاہوں، صحرائی وادیوں اور قافلوں کی گذرگاہوں سے قرب کو ملحوظ رکھا اور بس۔ چنانچہ یہ تینوں شہر تمدنی زندگی کے معیار سے گھرے ہوئے ہیں۔ عرب ان تمام مواد مدنیت اور لوازمات حضارت سے تہی دست تھے جو اُن کی عمرانیت اور آبادی میں اضافہ کرتے ان کے مساکن طبعی طور پر سکونت وقیام کے قابل نہ تھے اور دوسری متمدن اقوام کے درمیان واقع تھے کہ وہ انہیں آباد کرتے چنانچہ جوں ہی عربوں کا وقار ختم ہوا اور عرب عصبیت جوان شہروں کی آبادی میں کارفرما تھی فنا ہوئی یہ شہر بھی فنا اور بربادی کا شکار ہو گئے۔

اہل عرب صنعت وحرفت میں بھی سب سے زیادہ پس افتادہ تھے اس لیے کہ وہ بدویت میں حد سے زیادہ ڈوبے ہوئے اور تمدنی زندگی اور ان محرکات سے بہت دور تھے جو صنعت وحرفت کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں اسی لیے عرب کے قدیم مساکن اور اسلامی عہد کے مقبوضہ ممالک صنعت وحرفت سے بڑی حد تک خالی ہیں ہر قسم کے ضروریات زندگی دوسرے ممالک سے بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

اسی طرح عرب علوم وفنون سے بھی کوسوں دور واقع تھے، اس لیے کہ علم وفن از قبیل ملکات ہیں جو تعلیم و

تعلم اور کسب وتحصیل سے حاصل ہوتے ہیں۔ لہذا یہ بھی منجملہ دیگر صنائع کے ہیں جن سے عرب بالکل اجنبی ہیں علم و فن شہری ہیں، شہر کی مہذب ومتمدن فضا میں پرورش پاتے ہیں اور عرب بازار تہذیب وتمدن میں کوئی جنس گرانمایہ نہیں رکھتے۔ اس عہد میں شہریت اور عمرانیت کے مالک اہل فارس یا اُن کے ہم معنی موالی تھے اس لیے عہد اسلام میں بھی علوم وفنون کے علمبردار اہل فارس یا وہ عرب ہی تھے جو عجم میں تربیت پاکر عجمی بن گئے تھے لہٰذا علم وفن کی حفاظت وصیانت اور تصنیف وتالیف کا سہرا عجمیوں کے زیب سر رہا۔

عربوں کی فطرتِ سلیم وسادہ اکتسابی ملکات اور غیر فطری شہری عادات کی کجروی اور اخلاق رذیلہ کی نجاست سے پاک وصاف تھی ان میں بجز ہر قسم کی مشقت کو برداشت کرنے والی بدویت اور بآسانی اچھائی کو قبول کرنے والی جہالت اور سادگی کے اور کوئی بُری خصلت نہ تھی، اسی لیے وہ حق وصداقت کی صدا پر لبیک کہنے اور رشد وہدایت کا خیر مقدم کرنے میں دوسروں سے پیش پیش تھے۔ اور چونکہ عرب اپنی حمایت وحفاظت خود کرتے تھے دوسروں کے رحم وکرم پر نہیں جیتے تھے نہ دوسروں پر اس بارہ میں اعتماد کرتے تھے ہمیشہ اسلحہ اور آلات حرب زیب تن، ہر جانب سے ہوشیار اور ہر راہ سے چوکنے رہتے تھے، اسی لیے وہ شجاعت وجسارت اور دلیری وبہادری سے بہت قریب تھے۔ رعب ودبدبہ ان کی سرشت کا خاص جوہر تھا اور دلیری وبہادری ان کے خمیر میں پڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ حرب وپیکار میں بدوی اور خود سر عرب آئینی زندگی بسر کرنے والے عربوں سے زیادہ شجاعت وشہامت اور رعب ودبدبہ کے مالک تھے۔

عرب ہمیشہ قدرتِ کلام، شوکت بیان، فصاحت وبلاغت اور شیرینی وشستگی زبان میں تمام قوموں سے ممتاز رہے۔ یہی ہمیشہ اُن کا طغرائے امتیاز رہا ہے۔

۴۔ اولیری کا نظریہ عرب کے متعلق یہ ہے:-

مادی عرب جو صحیح معنی میں مادیت کا نمونہ ہو وہ ہر چیز کو فطری اور مادی نگاہ سے دیکھتا ہے اس کی نظر ہر چیز کی قیمت اسی منفعت کے لحاظ سے لگاتی ہے جس کے شعور واحساس پر طبع انسانی قادر ہو۔ رقیق تخیل

اور لطیف جذبات کا اس کے پاس گذر نہیں۔ دین و ملت کی طرف بھی اس کے رجحانات زیادہ نہیں ہوتے وہ ہر چیز کی پروا اسی قدر کرتا ہے جتنا عملی فائدہ اس پر مرتب ہو۔ شخصی عظمت اور عزتِ نفس کے احساس سے وہ پُر ہوتا ہے، اقتدار و رفعت کی ہر شکل پر وہ ٹوٹ پڑتا ہے۔ چنانچہ عرب کے قبیلہ کا سردار اور رئیس جنگ اپنی سرداری کے پہلے ہی روز سے قوم کی جانب سے بغض، حسد اور عداوت کا منتظر رہتا ہے حتیٰ کہ اپنے مخلص دوستوں سے بھی وہ یہی توقع رکھتا ہے، جو اس پر احسان کرتا ہے وہ اس کا دشمن بنجاتا ہے۔ اس لیے کہ احسانمندی اس کے اندر اپنی کمزوری و انکساری اور خواری و پستی کا احساس پیدا کر دیتی ہے اور یہ شعوری عداوت کا سبب ہوتا ہے۔ وہ محسن کا کچھ فرض اپنے اوپر سمجھتا ہے جس کا ادا کرنا اس پر لازم ہوتا ہے اور یہی مورثِ عداوت ہے۔

لامانس کہتا ہے "عربی دیمقراطیت (ڈیموکریسی) کا صحیح نمونہ ہے لیکن اس کی ڈیموکریسی حد اعتدال سے بہت متجاوز ہوتی ہے۔ ہر وہ اقتدار اعلیٰ جو اس کی حریت کو محدود کرنا چاہے اگرچہ وہ اس کے حق میں ہو عرب اس سے بغاوت کرتا ہے اور اُس کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ یہ ایک راز ہے جو ان تمام مسلسل جرائم، غداریوں اور خیانتوں کی حقیقت بے نقاب کرتا ہے جن سے تاریخ عرب کا بیشتر حصہ پُر ہے۔ اس رازِ نہفتہ کی بے خبری نے ہی ہمارے عہد حاضر میں اہل یورپ کو بہت سی غلط کاریوں اور خطاؤں کا مرتکب بنایا ہے اور بہت سی ایسی قربانیاں ان کے ہاتھوں سے لی ہیں کہ اگر وہ اس راز کو سمجھتے تو ان قربانیوں کی ضرورت نہ پیش آتی۔ عرب کی یہ سرکشی و درشتی اور اقتدار اعلیٰ سے تنفر و توحش ہی ان کو مغربی تمدن کے قبول کرنے سے باز رکھتا ہے یہ ان کے اور مغربی تمدن کے درمیان سدِ سکندری کی طرح حائل ہے۔ عرب کو اپنی آزادی سے ایسی شدید محبت ہے کہ اُس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اگر تم اس کی آزادی کو محدود یا اس کی وسعت میں کچھ کمی کرنا چاہو تو وہ اس قدر چراغ پا اور بے چین ہوگا جیسے پنجرے میں وحشی جانور اور غلامی کی زنجیروں کو پاش پاش کر ڈالنے اور حریت گم گشتہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے وہ مجنونانہ جوشِ عمل کے ساتھ حملہ آور ہوتا۔

یہ تصویر کا ایک رُخ ہے دوسری جہت سے دیکھو تو عرب نہایت مخلص اپنی قوم و قبیلہ کی اخلاقی اور عرفی

پابندیوں کو قبول کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہوتا ہے۔ وہ انتہائی کریم النفس ہوتا ہے ایک طرف مہمان نوازی اور دوستانہ معاہدوں کے فرائض پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کرتا ہے اور دوسری جانب دوستی کے حقوق عرف کے مقررہ رسم و آئین کے موافق نہایت اخلاص کے ساتھ ادا کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ میں عربی فطرت کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عرب کے ان خصائل و اوصاف کو اجتماعی نشوونما کے اس ارتقائی دور کی عام خصوصیات و صفات سمجھنا چاہیے کسی خاص قوم اور جماعت سے ان کا تعلق نہیں۔ ہر اجتماعی ترقی کرنے والی قوم کے لیے ان مراحل سے گذرنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ عرب نے بھی جب اجتماعی شہری زندگی کو اپنے لیے اختیار کیا اور زرعی معاشرت اختیار کی تو ان کی اس ذہنیت میں اعتدال پیدا ہوگیا۔ (ملخص)

(۵) ادبی کتابوں میں اُدبار کی ایک بڑی جماعت ان محققین کے خلاف رائے رکھتی ہے وہ عرب کو جملہ فضائل سے موصوف اور عیوب سے مبرا ثابت کرتی ہے۔ چنانچہ آلوسی بلوغ الادب میں طویل بحث کے بعد لکھتا ہے

خلاصہ یہ ہے کہ عرب چونکہ عقل و درایت اور فہم و فراست کے اندر سب سے زیادہ کامل اور قوتِ بیان میں سب سے زیادہ پرگو اور جری واقع ہوئے تھے لہذا ان خصائل نے انہیں ہر فضیلت و شرافت کا مالک اور ہر حسین ستائش و آفرین کا وارث بنا دیا تھا۔ ابن رشیق "عمدہ" میں لکھتا ہے۔

"عرب فضل و کمال میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں ان کی حکمت دانائی اور علم و فن بھی سب سے اشرف ہے"

محاکمہ | ہم طہارت عرب کے قائل نہیں۔ اور نہ ان آرا کی ہمارے نزدیک کوئی قدر و قیمت ہے جو عرب کو ہر طرح بزرگ و محترم اور ہر کمال کے ساتھ موصوف اور ہر عیب و نقص سے مبرا قرار دیں کیونکہ اس قسم کے نظریے تحقیق و تنقید کے علمی معیار سے گرے ہوئے ہیں۔ ہمارے خیال میں عرب دوسری اقوام عالم کی طرح ایک قوم ہے ان میں کچھ مخصوص امتیازات بھی ہیں اور عیوب بھی وہ اپنی ذہنیت، نفسانیت، اخلاق و آداب اور تاریخ کے اعتبار سے ہر علمی تنقید کے لائق اور محل بحث ہیں لہذا پانچویں رائے تو بحث و نظر کی مستحق ہی نہیں اسی طرح پہلا فریق شعوبین

بھی غلطی پر ہے جو یونانی فلسفہ اور رومانی قانون کا عرب سے مطالبہ کرتا ہے یا وہ چاہتا ہے کہ عرب ریشم بافی جیسی صنائع یا اصطرلاب جیسی اختراعات کے مالک ہوں۔ وہ ان ترقی یافتہ متمدن اقوام کا عرب جاہلیت سے موازنہ کرنا چاہتا ہے یہ غلط موازنہ ہے۔ موازنہ ان قوموں میں ہوسکتا ہے جو حضارت و تمدن کے ایک دور میں ہوں، ایسی دو قوموں میں موازنہ نہیں ہوسکتا جن میں ایک حضارت و تمدن کے آخری مدارج پر ہو اور دوسری مبتدی یہ موازنہ ایسا ہی ہے جیسے ایک بچہ اور بوڑھے کی عقل میں موازنہ کیا جائے۔ یہ فارس و روم وغیرہ ترقی یافتہ متمدن قومیں بھی اسی قسم کی وحشت و بربریت کے دور سے گذری ہیں اُس وقت نہ ان کے پاس فلسفہ تھا نہ ایجادات و اختراعات۔ اور اگر ترقی یافتہ اور متمدن عربوں سے موازنہ کرتے ہو تو اُن کے پاس علم و فلسفہ بھی ہے، حکومت بھی ہے اور قانون بھی ہے (اگرچہ کم ہے) لہٰذا ابن خلدون اور اولیری کی رائے در اصل بحث و تحقیق کی محتاج ہے۔

ابن خلدون کی رائے کا تجزیہ یہ ہے۔ عرب وحشی، غارتگر اور لٹیرا ہے۔ حکومت اگر اس کے قبضہ میں آجاتی ہے تو بہت جلد برباد ہو جاتی ہے کسی سردار کے لیے اس کا مطیع ہونا بہت دشوار ہے نہ صنعت و حرفت میں کوئی مہارت رکھتا ہے اور نہ علم و فن میں کوئی کمال اور نہ اس کے پاس ان چیزوں میں کمال و مہارت پیدا کرنے کی صلاحیت و قابلیت ہے وہ سلیم الفطرت ہے۔ ہر بھلائی کو قبول کرنے کے لیے آمادہ اور بہت بہادر ہے۔

اولیری کی رائے کا خلاصہ یہ ہے۔ عرب مادی، تنگ خیال اور منجمد جذبات کا مالک انسان ہے اپنی عظمت و حریت کا شدید ترین شعور رکھتا ہے۔ ہر اقتدار اعلیٰ پر حملہ آور اور اُس کو مٹا ڈالنے والا، آئین قبیلہ کی پابندیوں کو قبول کرنے کے لیے بغایت مخلص اور شریف انسان ہے۔

یہ دونوں محقق مادیت اور اقتدار اعلیٰ کی مزاحمت پر متفق ہیں۔ ان میں سے دوسری صفت مزاحمت اقتدار اعلیٰ ایک مسلم حقیقت ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اولیری بالکل سچ کہتا ہے کہ یہی خصلت ہمارے سامنے ان تمام جرائم اور خیانتوں کی حیثیت واضح کر دیتی ہے جن سے عرب کی تاریخ کا بڑا حصہ داغدار ہے پہلی صفت مادیت میں پروفیسر براؤن جیسے مستشرقین بھی ابن خلدون اور اولیری کی ہمنوائی کر رہے ہیں اور عرب

کو بدویت کے ساتھ موصوف سمجھتے ہیں۔ اور اس سے ان کی مُراد یہ ہوتی کہ "صرف مادی اور جسمانی چیزیں اور سیم وزر ہی ان کی نظر اعتبار میں وزن رکھتی ہیں باقی معنوی اور عقلی امور کی ان کی نگاہوں میں کوئی قدر و قیمت نہیں" حق یہ ہے کہ عرب کی کیا تخصیص آج بھی تم صحرانشین اقوام میں واضح طور پر اس حقیقت کا مشاہدہ کر سکتے ہو۔ رہا یہ کہ عہد جاہلیت کے تمام عرب قبائل میں یہ وصف موجود تھا؟ ہمیں تو اس میں شک ہے۔ عربی ادب کی کتابوں میں عربوں کی وفاداری اور جود و کرم کی حکایتیں اور آئین و مراسم قبیلہ کی حفاظت کے لیے جوانمردی کے ساتھ جان تک دے دینے کے واقعات اس رائے کے قطعاً منافی اور مخالف ہیں اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اولیری اور ابن خلدون جس "عربی" کی یہ صفت بیان کر رہے ہیں اُس کی تعیین اور تحدید نہ کرنا یہ ان کی سخت غلطی ہے، ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ عہدِ جاہلیت کا عرب بہت سے امور میں اسلامی عرب سے مختلف ہے بلکہ خود عہدِ جاہلیت کے عربوں میں بدوی عرب شہری عرب سے بالکل جُدا تھا اور اسی طرح عہد حاضر کے بدوی عہد جاہلیت کے بدوی سے بہت سے امور میں مختلف ہیں۔

ابن خلدون نے نہایت تحقیق کے ساتھ بحث کرنے کے باوجود اس عربی کا مصداق منضبط نہیں کیا جس کی وہ تعریف کرتا ہے۔ اسی لیے اس کے بیان میں تضاد اور اضطراب پایا جاتا ہے۔ اس کے بعض بیانات مثلاً یہ کہ عرب عالیشان عمارتوں کے بجائے صحرائی چولہوں کے لیے اور کڑیاں خیموں کی میخوں کے لیے اُکھاڑ لیجاتے ہیں۔ جب ہم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدوی عرب کے متعلق بحث کر رہا ہے اور اس بحث کا مصداق نہایت سخت قسم کا اُجڈ بدو ہے نہ کہ عہد بنو اُمیہ یا عباسیہ کا شہری اور متمدن عرب۔ دوسرے مقام پر اس کا یہ بیان کہ "عرب شہروں کے آباد کرنے کے لیے بہتر مقام انتخاب کرنے سے قاصر تھے جس کا مشاہدہ کوفہ اور بصرہ کے محل وقوع کے دیکھنے سے ہوتا ہے" بتلاتا ہے کہ جس عرب کا وہ حال بیان کر رہا ہے وہ عہد قدیم کا وحشی بدو نہیں بلکہ ابتداء عہد اسلام کا وہ اسلامی عرب ہے جس نے فارس و روم جیسے قدیم ملکوں کو فتح کیا ہے۔

شہروں کی بنیادیں ڈالنے والا بستیاں آباد کرنے والا عرب چولہوں کے پتھروں کے لیے قصور و محلات کو ڈھانے والا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ عرب علم و فن میں اچھی دسترس نہیں رکھتے اور میدانِ علم و فن کے سابقین اولین موالی ہیں"۔ یہ عرب نہ عہد جاہلیت کا بدوی ہے اور نہ ابتداءِ اسلام کا فاتح عرب ہے بلکہ یہ عہدِ عباسی کے آغاز اور بنو اُمیہ کے آخری عہد کا عرب ہے۔ ابن خلدون خود اپنے بیان کی تردید کرتا ہے۔ مقدمہ میں اس کے ایک بیان سے مفہوم ہوتا ہے کہ عربی فطرت میں تمدن و حضارت قبول کرنے کی کامل استعداد موجود ہے اور جن متمدن اقوام کے ساتھ وہ مل کر رہتا ہے اُن سے مدنیت کے استفادہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے "یہ صرف ایک نظریہ نہیں، بلکہ حقیقت واقعہ ہے کہ جب عربی فتوحات کا دروازہ کھل گیا، فارس و روم جیسی عظیم الشان سلطنتوں کے مالک عرب بن گئے، رومی و فارسی لڑکے لڑکیاں قیدی بن کر ان کی خدمت میں لائے گئے اور یہ خود تہذیب و تمدن اور شہری زندگی سے بالکل اجنبی تھے تو اس وقت عجیب و غریب واقعات پیش آئے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ جب چپاتیاں ان کے سامنے لائی گئیں تو ان کو اوراق کاغذ سمجھا اور کسریٰ کے خزانوں میں کافور پایا تو اُسے نمک سمجھ کر آٹے میں ڈالا۔ علیٰ ہذا القیاس بہرصورت جب عالمگیر فتوحات کے بعد پہلی سلطنتوں کے افراد کو خادم بنایا، معاشرتی نظام امور خانہ داری اور ضروریات زندگی میں ان سے کام لیا اور ان میں جو لوگ ان اُمور میں زیادہ قادر اور ماہر تھے اُنہیں اوروں پر ترجیح دی، اُن کی قدر افزائی کی تو ان لوگوں نے یہ تمام کام اُن کی تدابیر اور طریقے اور ان میں تفنن کے راستے اُنہیں سکھلائے اور ان کی بدولت عرب بھی ان امور معیشہ کے انتہائی منازل پر پہنچ گئے شہریت اور تمدنی اطوار و انداز ان میں رفتہ رفتہ پیدا ہو گئے اور نہ صرف ان کی طرح متمدن بن گئے۔ بلکہ کھانے پینے، اور لباس، عمارات، اسلحہ، فروش اور برتنوں میں نو بنو تکلفات اور جدتیں پیدا کیں۔

ابن خلدون کا یہ بیان پہلے بیانات کے بالکل متناقض ہے آپ دیکھتے ہیں کہ اُس نے ان بیانات میں مختلف عہدوں کے عربوں میں ضرر رساں اور مغالطہ انگیز خلط کیا ہے اور سب پر یکساں حکم لگا دیا ہے،

حالانکہ خود اس کا مقولہ ہے کہ "ماحول کے بدلنے سے خود عرب بھی بدل جاتا ہے"۔

اب اولیری کو لیجیے وہ لکھتا ہے کہ "عرب کا تخیل ناقص، مضمحل اور جذبات و احساسات منجمد و بے روح ہیں" تصورِ تخیل کا فیصلہ تو شاید اس نے اس بنیاد پر کیا ہے کہ اشعار عرب میں تمثیلی یا قصصی اشعار کا نام و نشان نہیں نہ ان میں بڑی بڑی لڑائیوں سے متعلق مثنویاں ہیں جن سے قوم کے فخریہ کارناموں کی یاد مستحکم بنیادوں پر قائم رہتی ہے۔ نہ کوئی ہومر کی مثنوی جیسی کوئی مثنوی ہے اور نہ شاہنامہ فردوسی جیسا کوئی رزمیہ شاہکار۔ پھر عہد جدید اور زمانہ ترقی میں بھی عرب کے پاس روایات و قصص تاریخی کی تالیف و تمثیل کے لیے تر و تازہ تخیل، پاکیزہ اشعار نہیں پائے جاتے۔

اس صنف شاعری میں ہم عرب کی کمزوری تسلیم کرنے کے باوجود یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تمثیلی شاعری پاکیزہ تخیل کا ایک مظہر ضرور ہے لیکن لطیف تخیل اسی میں منحصر نہیں بلکہ اس کے سوا بھی اس کے مظاہر ہو سکتے ہیں۔ اظہار نغز، بیان شجاعت، تغزل، توصیف، تشبیہ اور مجازیہ سب اصناف پاکیزہ تخیل اور لطیف جذبات کے مظاہر ہیں اور ان زمینوں میں اس قدر فراوانی کے ساتھ عرب کا کلام موجود ہے کہ دنیا اس سے مرعوب و حیران نظر آتی ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اس میں جدت کم تھی۔

عربی اشعار کا وہ ذخیرہ جو شستہ تغزل کی چاشنی، برباد شدہ کھنڈرات اور دیار حبیب میں غم کے آنسو بہانے کے مناظر، گذشتہ ایام عیش اور واقعات زندگی کی والہانہ یاد کی تجدید سے پُر ہے اور وہ لطیف وجدان پاکیزہ شعور جو ان مقدس جذبات کی محاکات کرتا ہے اور وہ سوز و گداز، دیوانگی و سرگشتگی جو ان نورانی احساسات کی تمثیل پیش کرتی ہے۔ ہرگز مردہ اور منجمد جذبات، بے روح و بے کیف شعور سے نہیں ادا ہو سکتے۔

جاحظ کی رائے کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اس بارہ میں نوشعوبیین سے متفق ہے کہ عرب کے پاس نہ علم ہے نہ فلسفہ اور نہ متوارث تصانیف مگر اسی کے ساتھ اس کا عقیدہ ہے کہ ان چیزوں کے بجائے انہیں قدرت نے دو ممتاز اور نمایاں صفات عطا کی ہیں۔ (۱) زبان آوری (۲) برجستہ بدیہہ گوئی۔ اس میں شک

نہیں کہ یہ دونوں صفتیں عرب میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔ اگر آپ ان کے آثار علیہ یعنی شعر و ادب پر ایک ہلکی سی نظر بھی ڈالیں تو آپ قدرت کے اس عطیہ یعنی صاف و شستہ زبان آوری اور برمحل بدیہہ گوئی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہونگے اس محاکمہ اور نقد تبصرہ سے عرب کے متعلق آپ ہماری رائے کی جھلک دیکھ چکے ہونگے اور یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے ہونگے کہ ذہنی اور اخلاقی ارتقار کے میدان میں جاہلی عرب اور اسلامی عرب یکساں نہیں لہذا اب ہم صرف عرب جاہلی کے اوصاف و خصائص پر روشنی ڈالتے ہیں۔

جاہلی عرب عصبانی مزاج کا مالک، غضبناک اور زود اشتعال ہوتا ہے۔ حقیر سے حقیر چیز پر اس کے غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور پھر اس کے شعلوں اور شراروں کی کوئی حد و انتہا نہیں ہوتی اور اگر کہیں اُس کے شخصی وقار یا قبیلہ کی عزت و حرمت کو ٹھیس لگتی ہے تو یہ اشتعال بہت سخت اور بھیانک قسم کا ہوتا ہے۔ جب بھڑکتا ہے تلوار کی طرف دوڑتا ہے اور تلوار کا فیصلہ ہی اسے منظور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلسل لڑائیوں نے انہیں فنا کر ڈالا اور جنگ ہی ان کا نظام مانوس اور شب و روز کی زندگی بن گئی۔

عصبانی مزاج کے لیے عادت ذکاوت لازم ہوتی ہے اور اس میں شک بھی نہیں کہ عرب واقعی ذکی ہوتا ہے اس کی ذکاوت اس کی زبان سے مترشح ہے۔ بسا اوقات وہ اسرار و رموز کی رہبری اور دور دراز اشاروں پر اعتماد کرتا ہے جس کے لیے اس کی برجستہ بدیہہ گوئی گواہ ہے۔ اچانک ایک چیز سامنے آتی ہے ابھی پورے طور پر آنے نہیں پاتی کہ وہ اس کا برجستہ جواب پیش کر دیتا ہے۔ مگر یہ ذکاوت جدت آفرینی اور مجتہدانہ شان نہیں رکھتی وہ ایک ہی حقیقت کو مختلف انداز اور پیرایوں میں پیش کرتا ہے اور یہ تفنن ہی تحقیق معانی اور اختراع حقائق سے زیادہ ناظرین کو محو حیرت اور مبہوت بنا دیتا ہے بالفاظ دیگر عرب کی زبان اُس کی عقل سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔

عرب کا تخیل محدود اور تفنن و تنوع سے ناآشنا ہے۔ اس کا تخیل بدویانہ معاشرت سے بہتر معاشرت اور صحرائی زندگی سے بہتر زندگی کی تصویر نہیں کھینچ سکتا کہ اس کے حصول کے لیے وہ جد و جہد کرے اسی لیے

"تصورات عالیہ" سے اُس کا ذہن نابلد ہے اس لیے کہ یہ بلند تخیل کا نتیجہ ہے جس سے وہ تہیدست ہے۔ نہ اس کی ڈکشنری میں اُن کے ادا کرنے کے لیے کوئی لفظ ہے اور نہ اُس کے کلام میں ان کی طرف کوئی ایما ر واشارہ ہے۔ عموماً اس کا شعری فکر کسی نئی دنیا میں شناوری نہیں کرتا کہ اُس سے جدید معانی سرسبز و شاداب ہوں بلکہ وہ اپنے محدود اور تنگ دائرہ میں رہ کر ہی مختلف راہوں میں گامزن ہوسکتا ہے اور بس۔

اخلاقی پہلو سے عرب کا رجحانِ حریت اور شعور آزادی اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ اُس کی تحدید نہیں ہوسکتی مگر حریت کا مفہوم ان کے دماغوں میں شخصی آزادی میں منحصر ہے اجتماعی حریت سے وہ قطعاً ناواقف ہیں۔ اسی لیے نہ کسی سردار کی اطاعت کے لیے اس کی گردن خم ہوسکتی ہے اور نہ کسی حاکم کی حکومت کا جوا وہ اپنے کاندھوں پر رکھ سکتا ہے۔ اس کی تاریخ جاہلیت میں ہی نہیں اسلام میں بھی خانہ جنگی سے پُر ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا عہد عرب کا "سنہری عہد" ہے کہ اُنھوں نے بیرونی حرب وپیکار کے خارزار میں الجھا کر اور روم وفارس کی فتوحات کا چسکا پیدا کر کے داخلی لڑائیوں اور خانہ جنگیوں سے بے خبر بنا دیا اور اس لیے کہ قدرت نے آنجناب کو عربوں کی نفسیات کے سمجھنے میں رائے صائب اور فہم راسخ عطا فرمائی تھی۔

عرب مساوات کا عاشق ہے لیکن اُس کا دائرہ اس کے قبیلہ میں محدود ہے۔ عشق مساوات کے دوش بدوش اپنے قبیلہ کی رفعت اور اس کے بعد عربی خون کی اہمیت بھی اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں ہمیشہ اس احساس کو موجود پاتا ہے کہ اس کی رگوں میں وہ خون دوڑ رہا ہے جس نے روم وفارس جیسی دیرینہ اور رفعت اساس سلطنتوں کے سامنے ان کی ثروت اپنے افلاس، ان کی خوشحالی اپنی فلاکت، ان کی شہریت اپنی بدویت کے باوجود سرنیاز خم نہیں کیا جب وہ ان ممالک کو فتح کرتا ہے تو اُن کو اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح ایک فاتح سلطان مفتوح قوم کو یا ایک آقا اپنے زرخرید غلام کو دیکھتا ہے۔ یہ عربی فطرت پر ایک اجمالی تبصرہ ہے اس کی تفصیل تم آئندہ فصلوں میں پاؤ گے۔

نتیجہ | عرب کی اس سادہ اور صاف ذہنیت اور متمدن اقوام کے اختلاط اور میل جول سے اس ذہنی اور نفسیاتی زندگی کا سرچشمہ پھوٹتا ہے جس کے صاف اور شیریں مظاہر تم عربی لغت، شعر، امثال اور حکایات میں پاتے ہو۔